مقدمہ شرح رموزِ بیخودی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مثنوی رموزِ بیخودی جب ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔ تو اس کے ساتھ حضرت علامہ نے ایک مختصر سا دیباچہ بھی شامل کر دیا تھا۔ جسے دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دیا تھا۔ چونکہ اس میں علامہ نے اس مثنوی کے مقاصد کی تشریح کی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اسی کو درج کرتا ہوں:

یہ مثنوی کسی طویل الذیل دیباچے کی محتاج نہیں تاہم اس کے مقاصد کی ایک مختصر تشریح ضروری ہے جس طرح حیاتِ افراد میں جلب منفعت، دفع مضرت، تعیینِ عمل و ذوق، حقائق عالیہ، احساس نفس کے تدریجی نشوونما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے۔ اسی طرح ملل و اقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر ''قومی انا'' کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تا کہ انفرادی اعمال کا تبائن و تناقض مٹ کر تمام کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔[1]

افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لیے بمنزلہ قوتِ حافظہ کے ہے جو اُس کے مختلف مراحل کے حسیات و اعمال کو مربوط کر کے ''قومی انا'' کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے۔

علم الحیات و عمرانیات کے اسی نکتے کو مدِ نظر رکھ کر مَیں نے ملتِ اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مختلف اجزا و عناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اسی نقطۂ نگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی مختص[2] الہیّت جماعت کا انحطاط زائل کرنے اور اُس کی زندگی مضبوط و محکم کرنے کے عملی اُصول کیا ہیں؟ اس سوال کا مجمل جواب مثنوی کے دونوں حصوں میں آ چکا ہے مگر مفصل جواب کے لیے ناظرین کو انتظار کرنا چاہیے اگر وقت نے مساعدت کی تو اس مثنوی کا تیسرا حصہ اسی سوال کا تفصیلی جواب ہوگا۔[3]

مثنوی کے مباحث پر ایک نظر

اس مثنوی کا مقصد تو علامہ کے ارشادات سے بالکل واضح ہو گیا، چنانچہ اس پر مزید حاشیہ آرائی کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس کے مباحث پر اجمالی تبصرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

اس مثنوی کے مباحث عالیہ پر مجموعی نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ علامہ نے اس میں اسلام کے دستور العمل کی وضاحت کر دی ہے۔ یعنی اس کے مطالعہ سے ہر شخص اسلام کے بنیادی افکار، اُصول اور ارکان سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ اور جو نقش اس کے مطالعہ سے دماغ میں قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دینِ اسلام بلاشبہ ایک مخصوص ہیئتِ اجتماعیہَ انسانیہ کا نام ہے، اس لیے وہ دنیا کے کسی نظام حیات یا دستور العمل سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اسلامی دستور العمل ایک عضوی کل کا حکم رکھتا ہے یعنی یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس کے کسی قانون کی خلاف ورزی کر کے ملتِ اسلامیہ میں شامل رہ سکے۔ اس دستور العمل کے اُصول اس طرح باہم مربوط ہیں کہ اگر ایک اصل کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ جس طرح مشین کا ایک پرزہ اگر اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو پوری مشین بیکار ہو جائے گی۔ مثلاً

(۱) اگر آپ ختمِ نبوت کے عقیدہ سے دستبردار ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قرآنِ حکیم کا یہ دعویٰ کہ میں آخری کتاب ہوں باطل ہو جائے گا۔

(۲) اگر آپ مساوات کے عقیدہ کا انکار کر دیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ نے اسود اور احمر، سرمایہ دار اور مزدور کے امتیاز کو اسلامی نظام میں داخل کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ "اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" کی تعلیم باطل ہو جائے گی۔

(۳) اگر آپ سود کو جائز کر دیں تو قرآن کا تمام معاشی نظام زیر و زبر ہو جائے گا۔

(۴) اگر آپ ملوکیت کو تسلیم کر لیں تو توحیدِ الٰہی کا عقیدہ باطل ہو جائے گا۔

(۵) اگر آپ یہ تسلی کر لیں کہ صداقت، قرآنِ حکیم سے باہر بھی پائی جاتی ہے یا پائی جا سکتی ہے تو تبلیغ و اشاعت اسلام کا فریضہ ساقط ہو جائے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی حیات کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

(۶) اگر آپ سیاست کو دین سے جدا کر دیں تو دین کی حیثیت سے اسلام بالکل ختم ہو جائے گا، محض پوجا پاٹ کا نام رہ جائے گا۔

(۷) اگر آپ زندگی کے کسی ایک شعبے میں بھی دنیا کے کسی آدمی کو اپنا رہنما تسلیم کر لیں تو آنحضرتؐ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا عقیدہ باطل ہو جائے گا۔

میرا خیال ہے کہ ان چند مثالوں سے میرا مطلب ناظرین پر بخوبی واضح ہوگیا ہوگا کہ اسلام کا ایک کامل اور مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس کا یہ دعویٰ ہے کہ میرے علاوہ تمام نظام باطل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں یہ اعلان فرما دیا ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (۹:۳۳)

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ تا کہ وہ اس کو تمام ادیان عالم پر غالب کر دے، اگر چہ یہ فعل مشرکوں کو تو ضرور نا گوار گزرے گا۔

اس آیت سے، جو اپنے مفہوم کی وضاحت کے لیے کسی تفسیر کی محتاج نہیں ہے، یہ بات بالکل روشن ہے کہ دینِ اسلام ساری دنیا کے خلاف چیلنج یا الٹی میٹم ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ اس دین (دستور العمل) کو دنیا کے تمام ادیان پر غالب کرے اور چونکہ یہ کام صرف اسی صورت سے وقوع پذیر ہوسکتا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان مل کر اظہارِ دین کے لیے جدو جہد کریں اس لیے ہر مسلمان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اجتماعی زندگی بسر کرنا سیکھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظمؓ نے مسلمانوں کو یہ نصیحت فرمائی کہ ''لا اسلام الا بالجماعة''، یعنی جماعت سے علیحدہ رہ کر کوئی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور اقبال دونوں کی یہ تعلیم قرآن حکیم کی اس آیت سے مقتبس ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (۳:۱۰۳)

اے مسلمانو! سب مل کر اللہ کی رسی (قرآنِ حکیم) کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔ اور اپنے آپ کو مختلف فرقوں میں تقسیم مت کرو۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ جب تک سارے مسلمان قرآنِ حکیم پر جمع نہیں ہوں گے، وہ اس کی نشر و اشاعت کے لیے کوئی متحدہ کوشش نہیں کر سکتے اور جب متحدہ کوشش نہیں ہوگی تو قرآنِ حکیم، ادیانِ عالم پر غالب کیسے آ سکتا ہے؟ چونکہ آج ہم مسلمان مختلف فرقوں میں منقسم ہو چکے ہیں، اس لیے قرآنِ حکیم کو دنیا میں شائع کرنے کے لیے نہ کوئی جماعت کوشش کر رہی ہے نہ کوئی حکومت، نہ کوئی مملکت۔ کیا یہ انتہائی افسوس کا مقام نہیں ہے کہ سعودی حکومت نے بھی قرآنِ حکیم کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ابھی تک کوئی کوشش نہیں کی۔

چو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی!

خلاصہ کلام یہ ہے کہ رموزِ بیخودی میں اقبال نے قرآنِ حکیم کی اسی آیت شریفہ کی تفسیر کی ہے کہ

(۱)　اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے۔

(۲) آپؐ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ آپؐ (اور آپؐ کے متبعین) اس دین (دستور العمل) کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کر دیں۔ یعنی تمام باطل ادیان کو دنیا سے مٹا دیں۔ تاکہ ساری دنیا دینِ حقّہ (اسلام) کی پیرو (مطیع) بن جائے اور ساری دنیا میں ایک ہی دستور العمل نافذ ہو جائے جس کا نام اسلام ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ (۱۹:۳)

یعنی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صرف اسلام ہی سچا دین (دستورِ حیات) ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ مسلمان سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے پسندیدہ دین (دستور العمل) کو دنیا میں نافذ کر دیں۔

(ا) یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دوسرے ادیان مٹ جائیں۔

(ب) اور یہ اسی صورت سے ممکن ہے کہ سارے مسلمان مل کر دینِ اسلام کے غلبہ کے لیے جدوجہد کریں۔

(ج) اور متحدہ کوشش اسی وقت ہو سکتی ہے جب سارے مسلمان قرآنِ حکیم کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیں۔ یعنی قرآنِ حکیم پر جمع ہو جائیں۔

اس تصریح کے بعد اب ہم مثنوی کے مطالب کا خلاصہ بیان کرتے ہیں:

علامہ نے اس مثنوی کو کسی شخص سے منسوب کرنے کی بجائے ملتِ اسلامیہ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ موجودہ صدی میں کسی مسلمان نے اس سے بہتر ہدیہ اپنی قوم کی خدمت میں پیش نہیں کیا۔ تمہید میں علامہ مرحوم نے فرد و ملت کے ربط باہمی کو واضح کیا ہے۔ تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ پہلے باب میں اُنھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ملت (قوم) افراد کے اختلاط سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسرے باب میں اُنھوں نے ملتِ اسلامیہ کے بنیادی ارکان میں سے پہلے رکن "توحید" کا بیان کیا ہے۔

تیسرے باب میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ عقیدۂ توحید، یاس و حزن و خوف اور دوسرے رُوحانی امراض کا ازالہ کر سکتا ہے۔ اور اس نکتہ کو تیر و شمشیر اور حضرت عالمگیرؒ کی حکایت سے واضح کیا ہے۔

چوتھے باب میں اسلام کے دوسرے بنیادی رکن "رسالت" کی توضیح کی ہے۔

پانچویں باب میں یہ بتایا ہے کہ رسالتِ محمدیہ کی غایت یہ ہے کہ بنی آدم کو حریت، اخوت اور مساوات (اُصول سہ گانہ) کی دولت نصیب ہو جائے، اور ان اُصول سہ گانہ کا مفہوم تین تاریخی حکایات کی روشنی میں واضح کیا ہے۔

چھٹے باب میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ملتِ محمدیہؐ چونکہ توحید اور رسالت پر مبنی ہے۔ اس لیے کسی خاص ملک سے وابستہ نہیں ہے۔ اس نکتہ کو اُنھوں نے جداگانہ باب میں واضح کیا ہے۔ یعنی مسلمانوں کی

قومیت کی بنیاد وطن نہیں ہے بلکہ توحید ہے۔

ساتویں باب میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ جس طرح اُمتِ محمدیہؐ مختص بالمکان نہیں ہے۔ اسی طرح مختص بالزمان بھی نہیں ہے۔ یعنی یہ ملت شریفہ قیامت تک باقی رہے گی۔

آٹھویں باب میں یہ بیان کیا ہے کہ قانون کے بغیر کسی قوم کا نظام صورت پذیر نہیں ہوسکتا، اور ملتِ محمدیہؐ کا قانون (ضابطۂ حیات) قرآن ہے۔

نویں باب میں یہ بتایا ہے کہ جب قوم کے اندر ذہنی اور عقلی اعتبار سے انحطاط رُونما ہو جائے تو اجتہاد کی بجائے تقلید زیادہ مناسب حال ہوتی ہے۔

دسویں باب میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ قومی سیرت کی پختگی صرف شریعتِ الٰہیّہ کی پابندی سے ہوسکتی ہے۔

گیارہوں باب میں اس راز کو فاش کیا ہے کہ قومی سیرت میں دلکشی محض اتباعِ رسولؐ سے پیدا ہوسکتی ہے۔

بارہویں باب میں یہ بات بیان کی ہے کہ قومی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک مرکز محسوس کرنے کی ضرورت ہے اور وہ مرکز بیت الحرام ہے۔

تیرہواں باب اس ساری کتاب کی جان ہے اور اس میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ حقیقی جمعیت اس وقت پیدا ہوسکتی ہے کہ قوم کا ہر فرد ملی نصب العین کے حصول میں منہمک ہو جائے اور امتِ محمدیہؐ کا نصب العین توحید الٰہی کی حفاظت اور اشاعت ہے۔

چودہویں باب میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی قوم، نظامِ عالم کی قوتوں کو مسخر کر لے تو اُس کی قومی زندگی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

پندرہویں باب میں اس نکتہ کی صراحت کی ہے کہ حیاتِ ملی کا کمال یہ ہے کہ فرد کی طرح ملت میں بھی خودی کا احساس پیدا ہو جائے اور یہ احساس، ملی روایات کی حفاظت اور ان پر عامل ہونے سے پیدا ہوسکتا ہے۔

سولہویں باب میں یہ بات بیان کی ہے کہ نوعِ انسانی کی بقا عورت کی ماں ہونے کی حیثیت پر موقوف ہے۔ لہٰذا عورتوں اور خاص طور سے ماؤں کا احترام اسلام کی بنیاد ہے۔

سترہویں باب میں اُنھوں نے یہ بتایا ہے کہ سیّدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ مسلمان عورتوں کے لیے بہترین نمونہ ہیں۔

اٹھارہویں باب میں اقبال نے مسلمان عورتوں سے خطاب کیا ہے اور ان کو اسوۂ بتولؓ پر عامل ہونے کی تلقین کی ہے۔

اس کے بعد اُنھوں نے مثنوی کے مطالب کو سورۂ اخلاص کی تفسیر کے ضمن میں بیان کیا ہے اور اس

میں شک نہیں کہ اس باب میں اُنھوں نے بہت ندرتِ فکر کا ثبوت دیا ہے۔ یعنی آیتوں کا مطلب بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ یہی رنگ اپنے اندر پیدا کرو۔

آخر میں اُنھوں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں پہلے اپنا حال دل بیان کیا ہے۔ اس کے بعد یہ درخواست کی ہے:

ہست شانِ رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

رموزِ بیخودی میں حضرت اقبال نے دنیا کو اس دستور حیات کے بنیادی اُصول سے آگاہ کیا ہے جسے قرآن کریم نے دینِ اسلام سے تعبیر کیا ہے۔ یہ دین بلا شبہ ادیان عالم میں عدیم المثال اور فقید النظیر ہے، لیکن اس دین کے پیرو بارہ سو سال سے اس کے پیش کردہ آئین سے بکلی منحرف ہو چکے ہیں اور گزشتہ تین چار سو سال سے تو یہ حالات ہے کہ اسلام وہ اسم ہے جس کا مسمیٰ خارج میں کہیں موجود نہیں[۴] ہے، اس لیے اس کی بنیادی خصوصیات ایک ایک کر کے پردۂ خفا میں مستور ہو چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی آئین کو خوبی صرف اس آئین پر عمل کرنے ہی کی بدولت اہلِ عالم پر آشکار ہو سکتی ہے۔

دراصل دینِ اسلام، جملہ ادیان و مذاہب عالم اور انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کے تمام ضابطوں کے خلاف ایک زبردست چیلنج ہے، یعنی دعوتِ مبارزت ہے۔

چنانچہ قرآنِ حکیم کی آیت میرے دعویٰ پر شاہد ہے:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ (۸۱:۱۷)

اور آپؐ اعلان کر دیجیے کہ "الحق" آ گیا (اس کے آنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ باطل مٹ جائے گا۔ بالفاظ دیگر باطل کا مٹ جانا یقینی ہے۔ اس لیے قرآنِ حکیم نے ماضی کا صیغہ استعمال فرمایا) اور مٹ گیا۔ "الباطل" بلا شک باطل کی ذات میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مٹ جانے والا ہے یعنی حق کے مقابلہ میں اُسے کبھی ثبات و دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ تو اس کے اقتضائے ذات کے خلاف ہے۔ میں نے یہ مفہوم عارف علوم ربّانی دانائے حقائقِ قرآنی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مجدد دہلوی کے ترجمہ سے اخذ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وبگوئید آمد دینِ حق و نابود شد دینِ باطل۔ ہر آئینہ باطل است نابود شوندہ۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے الحق کا ترجمہ دینِ حق کیا ہے اور دینِ حق صرف قرآنِ حکیم کے اندر محصور ہے۔ اس کے باہر کہیں دینِ حق نہیں ہے اور الباطل کا ترجمہ دینِ باطل کیا ہے یعنی دنیا کے تمام ادیانِ باطلہ۔ الحق کا مطلب یہ ہے کہ صرف قرآن ہی حق ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے، سب باطل ہے۔[۵]

اس آیت شریفہ سے ثابت ہوگیا کہ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ صداقت، ہدایت اور حق قرآنِ حکیم کے علاوہ اور کسی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ بالفاظ دگر دینِ اسلام کے علاوہ اور تمام ادیان و مذاہب عالم باطل ہیں۔ اور یہی مطلب ہے قرآن حکیم کی ان آیتوں کا:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ (۳:۱۹)

بلاشبہ خدا کے نزدیک دینِ معتبر صرف اسلام ہی ہے۔

وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ ج وَ ھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَo (۳:۸۵)

اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی طلب کرے گا۔ وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اُس سے اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ اسلام کے علاوہ اور کوئی دین، اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالیہ میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ دینِ اسلام اس وقت قرآنِ عزیز کے علاوہ اور کسی کتاب میں محفوظ نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب مقدس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَo (۱۵:۹)

بے شک ہم ہی نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور بلاشبہ ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

خلاصہِ کلام یہ ہے کہ دینِ اسلام صاف اور صریح لفظوں میں یہ اعلان کرتا ہے کہ صداقت اور ہدایت اس وقت قرآن کے علاوہ اور کہیں موجود نہیں ہے۔ کسی مذہب میں نہیں ہے۔ کسی نظامِ اخلاق میں نہیں ہے اور کسی ہیئتِ اجتماعیہ میں نہیں ہے۔ اب ناظرین خود فیصلہ کر لیں۔ کہ کیا دوسرے لفظوں میں یہ ساری دنیا کو چیلنج نہیں ہے؟

دینِ اسلام کی تمام خصوصیات کی تفصیل تو اس تمہید میں ناممکن ہے۔ اس لیے صرف ایک خصوصیت کے بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ دنیا میں جس قدر مذاہب ہیں وہ سب انسان کی اخروی نجات کا بندو بست کرنے کے مدعی ہیں، دنیاوی زندگی کے لیے کوئی ضابطہ یا دستور العمل پیش نہیں کرتے۔ لیکن دینِ اسلام ایک مکمل دستورِ حیات ہے یعنی وہ ایک اخلاقی نصب العین بھی ہے اور ایک نظام سیاست و معاشرت بھی ہے چنانچہ فرد اور جماعت کی زندگی کا کوئی شعبہ اس کی گرفت میں آزاد نہیں ہے اور جہاں تک بنیادی اُصول کا تعلق ہے، اسلام کسی نظام سے مفاہمت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام مذہبوں اور اخلاقی نظاموں کو مٹا کر اپنا قانون نافذ کرنا چاہتا ہے۔ یعنی ایک مسلمان زندگی کے کسی شعبہ میں بھی کسی دوسرے شخص کی رہنمائی قبول نہیں کر سکتا۔ اس کی وفاداری کا آخری مرجع صرف قرآنِ حکیم اور سنتِ رسولؐ ہے۔

چونکہ دین اسلام زندگی کا ایک مکمل ضابطہ ہے اس لیے وہ یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا کے انسان ایک سلک میں منسلک ہو جائیں اس مقصد کے لیے اس نے ایسا حیرت انگیز ضابطہ نافذ کیا ہے کہ دنیا کے کسی قدیم یا جدید مذہب یا نظامِ فکر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یعنی اس نے ساری دنیا کے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

(الف) جو لوگ سرکارِ مدینہ ﷺ کی غلامی اختیار کر لیں وہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہیں۔ خواہ وہ کالے ہو یا گورے اور چینی ہوں یا جاپانی۔

(ب) جو لوگ حضورِ انور ﷺ کی غلامی سے انکار کریں وہ سب ملتِ کفر کے افراد قرار دیے جائیں گے۔ الکفر ملة واحدة یعنی دینِ اسلام کی رو سے مسلمانِ عالم کی بنیاد، نہ وطن ہے نہ رنگ نہ نسب ہے نہ زبان، بلکہ عقیدۂ توحید ہے۔ چونکہ یہ تعلیم دینِ اسلام کو تمام مذاہبِ عالم سے متمیز کر دیتی ہے۔ اور نظریہ قومیت و وطنیت اسلام کے بنیادی اُصول کی بیخکنی کر دیتا ہے۔ اس لیے علامہ اقبال نے ۱۹۰۴ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک یعنی ساری عمر اس غیر اسلامی نظریہ کے خلاف جہاد کیا۔ چنانچہ ارمغان میں لکھتے ہیں:

چو رومی در حرم دادم اذاں من　　از و آموختم اسرار جاں من
بدورِ فتنۂ عصر کہن او　　بدورِ فتنۂ عصر رواں من

رموزِ بیخودی کا خلاصہ یہ ہے کہ دینِ اسلام، دیگر مذاہب کی طرح محض پوجا پاٹ کا نام نہیں ہے یا فرد کا پرائیویٹ معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا نام ہے۔ اس لیے کوئی مسلمان ملت سے جدا ہو کر اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اور جب یہ ممکن نہیں تو وہ اپنی خودی کو بھی مرتبۂ کمال تک نہیں پہنچا سکتا۔

اب میں خود علامہ کی تحریروں سے اس نکتہ کو واضح کرتا ہوں۔ تاکہ ناظرین کے دلوں پر اس کی اہمیت نقش ہو جائے۔

جس طرح نوعِ انسان کی مجموعی ترقی کے لیے مختلف اقوام کا نیست و نابود ہو جانا ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی لازمی ہے کہ کسی قوم کے ارتقا کے لیے کئی افراد نذرِ اجل ہو جائیں یا قوم کے نشوونما کی خاطر ان کے ذاتی حقوق کی پرواہ نہ کی جائے۔ لیکن یہاں ایک عجیب اور مشکل سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ یہ ہے کہ جس صورت میں کسی خاص فرد کو قوم کی آئندہ نسلوں کی بہبودی، ان کی عظمت و جلال اور ان کی عقلی اور تمدنی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تو کیوں اس کے ذاتی حقوق پر قومی ارتقا کو ترجیح دی جائے؟ کیا میں آج سے سو سال کے بعد زندہ ہوں گا؟ اگر نہیں تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے آپ کو قوم کے لیے قرباں کر دوں؟ اور اپنی نیند حرام کر کے قوم کی آئندہ بہبودی کے لیے بے خواب راتیں بسر کروں؟ اگرچہ اس سوال کا کوئی عقلی

جواب ہمارے پاس نہیں ہے لیکن اس خطرناک شبہ کے وقت مذہب ہماری دستگیری کرتا ہے۔ اور ہمیں بتاتا ہے کہ ایثار یعنی اوروں کے نفع کو اپنے ذاتی نفع پر مقدم رکھنے کی بنا پر عقلی نہیں ہے۔ بلکہ یہ نیکی جو ارتقا نوعِ انسانی وقومی کے لیے بہت ضروری ہے، ایک فوق العادت اُصول پر مبنی ہے۔ آوازِ نبوت کا اصلی زور اور اس کی حقیقی وقعت عقلی دلائل اور براہین پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا دارو مدار اس روحانی مشاہدہ پر ہے جو نبی کی غیر معمولی قوتوں کو حاصل ہوتا ہے جس کی بنا پر اس کی آواز میں وہ ربّانی سطوت اور جبروت پیدا ہو جاتا ہے۔ (ماخوذ از رسالہ مخزن بابت اکتوبر ۱۹۰۴ء)

مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصلی اُصول نہ اشتراکِ زبان ہے، نہ اشتراکِ وطن اور نہ اشتراک اغراض اقتصادی، بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالتمآب ﷺ نے قائم فرمائی تھی، اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں، وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام تمام مادّی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے، اور اس کی قومیت کا دارو مدار ایک خاص تنزیہی تصور پر ہے، جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے، جس میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قومِ عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا، اس کی پولیٹیکل نشوونما میں بہت بڑا حصہ لیا۔ لیکن اسلامی علوم وفنون اور فلسفہ وحکمت کے انمول موتیوں کے رولنے کا کام زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے سرانجام دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کا ظہور قوم عرب کی زندگی کی تاریخ میں یزداں طلبی کی آنی و عارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برق کی چشمک تھی یا شرار کا تبسم تھا لیکن اسلام کی دماغی توانائیوں کی جولا نگاہ عرب نہ تھا بلکہ عجم تھا۔ پس چونکہ اسلام کا جوہر ذاتی بلا کسی آمیزش کے خاص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے۔ لہٰذا کیونکر ممکن تھا کہ وہ قومیت کو کسی خارجی یا حسی اُصول مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جائز تصور کرے؟ (ماخوذ از ملتِ بیضا پر عمرانی نظر)

اسلام کی حقیقت ہمارے لیے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا جب تک کہ ہم اُصولِ اسلام سے پُوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی وطن ہے، جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہی نسبت اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اُصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں ''خدا کی رسی'' ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔

ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر نظر نہیں ڈال کر اغیار کے تمدن کو بلا مشارکتِ احدے اپنا

ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ اور یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ کسی اسلامی مصنف نے اس حقیقت کو مولانا اکبرالہ آبادی سے زیادہ واضح طور پر نہیں بیان کیا۔ چنانچہ وہ نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک نظر غائر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجہ میں پکار اُٹھتے ہیں:

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخِ مرحوم کنایہ ہے ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کے اُس قدامت انتساب نام لیوا سے جو مغربی تہذیب و تعلیم کے بارے میں سرسیّد احمد خاں مرحوم کے ساتھ مدت العمر پڑا جھگڑا کیا۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے شیخ کا خوف بے بنیاد نہ تھا۔ کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ ''شیخ مرحوم'' کے قول میں جو صداقت مضمر ہے، اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے۔ مجھے رہ رہ کر یہ رنجیدہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب العلم جو اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے۔ روحانی طور پر بمنزلہ ایک بے جان لاش کے ہے۔ اور اگر موجودہ صورت حالات بیس سال تک[۶] قائم رہی تو وہ اسلام رُوح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علم برادروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے۔ ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی۔ وہ لوگ جنھوں نے تعلیم کا یہ اصل اُصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز کلام مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیے۔ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی راہیئت اور نوعیت سے بہت زیادہ باخبر تھے۔

خودی اور بےخودی میں نسبتِ باہمی

بعض لوگ قلتِ تدبر کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ خودی اور بےخودی میں تباین یا تضاد کی نسبت ہے۔ اس غلطی کا مبنیٰ یہ ہے کہ فارسی زبان میں لفظ ''بے'' سے نفی مراد ہوتی ہے۔ مثلاً ہوشیار سے ہوش کر نفی کرنے کے لیے بے ہوش اور زردار سے زر کی نفی کے لیے بے زر کی ترکیب مستعمل ہے۔ لیکن یہاں بےخودی سے خودی کی نفی مراد نہیں ہے، اس لیے ان لفظوں میں تباین یا تضاد کی نسبت نہیں ہے۔ یعنی بےخودی، خودی کی ضد نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں لفظوں میں عدم و ملکہ کی نسبت ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

(۱)　دو چیزوں میں جو نسبتیں قائم کی جاتی ہیں وہ دو اعتبار سے کی جاتی ہیں۔

(الف)　یا تو صدق و حمل کے اعتبار مثلاً نسبت تباین یا تساوی یا عموم و خصوص۔

(ب)　یا وجود کے اعتبار سے مثلاً تضاد یا تضایف یا عدم و ملکہ۔

نوٹ:　جن چیزوں میں تساویٰ یا عموم و خصوص کی نسبت ہوتی ہے، ان میں تضاد یا تضایف کی نسبت قائم نہیں ہوسکتی، بلکہ ان میں اتحاد کلی یا اتحاد جزئی کی نسبت ہوتی ہے۔

(۲) جب دو مفہوم ایسے ہوں کہ اُن دونوں کا ایک ہی حیثیت سے ایک زمانہ میں اور ایک محل میں اجتماع نہ ہو سکے، اور ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے عدم پر مشتمل ہو، لفظاً یا معناً، تو ان میں ایجاب وسلب یا عدم وملکہ کی نسبت ہی متصور ہو سکتی ہے۔

جو ذات اس عدمی وصف کے ساتھ موصوف ہو اگر اُس میں وصفِ وجودی کے ساتھ موصوف ہونے کی صلاحیت ہے تو عدم وملکہ کی نسبت ہے۔ اور اگر یہ صلاحیت نہ ہو تو ایجاب وسلب کی نسبت ہے۔

(۳) خودی ایک مفہوم وجودی ہے اور بے خودی اسی خودی کے عدم پر مشتمل ہے، اور جو ذات، بے خودی کے وصف کے ساتھ موصوف مانی جائے وہ وہی ہو سکتی ہے جس میں خود کے ساتھ متصف ہونے کی صلاحیت موجود ہو کیونکہ جو خودی کا موصوف نہیں بن سکتا، اس کو ہم بے خود بھی نہیں کہہ سکتے۔

(۴) اس سے ظاہر ہوا کہ خودی اور بے خودی میں عدم وملکہ کا تقابل پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ وہ ذات جو خودی کے ساتھ موصوف ہو۔ وہ کسی دوسری حیثیت سے بے خودی کا محل بن جائے۔ اسی طرح وہ ذات جو کسی اعتبار سے کسی بے خودی کے ساتھ متصف ہے وہ دوسرے اعتبار سے محلِ خودی ہو جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حالات و ازمنہ کے تغیر سے ایک ہی محل میں خودی اور بے خودی دونوں کیفیتیں یکے بادیگرے متوارد ہوتی رہیں۔ کیونکہ متقابلین کے لیے دو جہتوں سے مجتمع ہو جانا، یا مختلف حالات و ازمنہ میں انکا متوارد ہو جانا عقلاً ناجائز نہیں ہے۔ مثلاً محبت اور عداوت اگر چہ صفات متقابلہ ہیں لیکن ایک ہی شخص میں ایک ہی وقت میں پائی جاسکتی ہیں۔ مثلاً زید ایک ہی وقت میں رام سے محبت کر سکتا ہیاور شام سے نفرت کر سکتا ہے۔

(۵) اسی طرح خودی اور بے خودی یہ دونوں صفات ایک ہی شخص میں ایک ہی وقت میں پائی جاسکتی ہیں۔ پس ثابت ہو گیا کہ خودی اور بے خودی میں تباین یا تضاد کی نسبت نہیں ہے بلکہ عدمِ وملکہ کی نسبت ہے یعنی ایک شخص خودی کی منزل میں رہتے ہوئے بے خودی کی منزل میں بھی آ سکتا ہے۔

(شرح رموزِ بیخودی از یوسف سلیم چشتی)

حواشی وحوالہ جات

۱- تباین اور تناقض دونوں منطقی اصطلاحیں ہیں ان کا مثالوں سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔
(ا) انسان اور درخت میں تباین کی نسبت اور
(ب) انسان پر اور لا انسان میں تناقض کی نسبت پائی جاتی ہے۔

اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ حدود کے مقرر ہو جانے سے افراد کے اعمال میں بڑی حد تک یگانگت اور یکسانیت پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ جن افراد کی منزل مقصود ایک ہوتی ہے ان میں وحدتِ کردار کا پایا جانا یقینی ہوتا ہے۔

۲- اس لفظ سے علامہ کی مراد یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اجتماعی زندگی کے لیے جو دستور العمل عطا فرمایا ہے اس کی نظیر اقوام عالم میں کہیں نہیں مل سکتی۔ مثلاً دنیا کی تمام قوموں نے اپنی قومیت کی بنیاد، وطن، نسب، رنگ یا نسل پر رکھی ہے۔ لیکن قرآن حکیم نے عقیدۂ توحید کو ملتِ اسلامیہ کی قومیت کی بنیاد قرار دیا ہو اور اسی نکتہ کو علامہ نے یوں بیان کیا ہو۔

اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

(بانگِ درا)

۳- علامہ نے اس مثنوی کا تیسرا حصہ تو نہیں لکھا لیکن اس سوال کا تفصیلی جواب جاوید نامہ اور ضربِ کلیم میں ہدیہ ناظرین کر دیا ہے۔

۴- حضرت قدس مجدد الف ثانیؒ المتوفی ۱۰۳۴ھ نے اپنے مکتوبات میں کئی جگہ اس تلخ حقیقت کا اظہار فرمایا کہ ''اکنوں از اسلام بجز اسمے ہیچ شے باقی نماندہ است'' نیز حضرت مجدد دہلویؒ المتوفی ۱۱۷۶ھ نے ایک جگہ بایں الفاظ اپنے تاثرات بیان فرمائے کہ ''مسلماناں در گور، مسلمانی در کتاب'' واضح ہو کہ ہندوستان میں دینِ اسلام سے مسلمانوں کی برگشتگی کا سب سے بڑا سبب اکبر مرتد کا پیدا کردہ وہ فتنہ تھا جسے تاریخ میں ''دینِ الٰہی'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جبھی تو اقبال نے یہ لکھا ہے:

تین سو سال ہیں ہند کے میخانے بند اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

۵- افسوس کہ اغیار کو خوش کرنے کے لیے صاحبِ ترجمان القرآن نے قرآنِ عزیز کی اس بنیادی تعلیم کو مداہنت کے غلاف میں پوشیدہ کر دیا۔ اور حق و باطل کو مخلوط کر کے ایک ایسے اسلام کی ترجمانی کی ہے جسے نہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور نہ کوئی غیر مسلم اُسے قبول کرنے کی طرف راغب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب عالمگیر صداقتیں تمام مذاہب میں موجود ہیں تو کسی کو کیا پڑی ہے کہ اپنا مذہب چھوڑ کر بدیشی مذہب اختیار کرے؟

۶- علامہ مرحوم نے یہ اندیشہ ۱۹۱۲ء میں ظاہر کیا تھا، اور وہ صورتِ حالات چالیس سال سے بعینہٖ قائم ہے، لہٰذا ناظرین خود فیصلہ کر لیں کہ اس وقت ۱۹۵۲ء میں وہ ''اسلامی رُوح'' جس کی بقا کے لیے مرحوم نے ساری عمر جدوجہد کی ''ہماری جماعت'' میں کس حد تک باقی رہ گئی ہوگی۔ میرے خیال میں اسی صورتِ حالات کو دیکھ کر اکبر الہ آبادی نے یہ شعر لکھا تھا:

دین سے ملت سے یا اللہ سے الفت ہوتی کیوں دودھ تھا ڈبہ کا اور تعلیم تھی سرکار کی